باب ششم

فہم قرآن کے اصول

فہم قرآن کے سلسلہ میں درج ذیل عنوانات کی تفہیم ضروری ہے۔

۱) قرآن کریم کا اسلوبِ استدلال

قرآن کے طالب علم کو جاننا چاہیے کہ قرآن کا اسلوب استدلال منطقی نہیں' فطری ہے۔ انسان جس فلسفے سے واقف ہے اس کی بنیاد منطق ہے۔ چنانچہ ہمارے فلاسفہ اور متکلمین استخراجی منطق (Deductive Logic) سے اعتناء کرتے رہے ہیں' جبکہ قرآن مجید نے اسے سرے سے اختیار نہیں کیا۔ وقتی تقاضے کے تحت ہمارے متکلمین نے اسے اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن اس سے کوئی زیادہ فائدہ نہیں پہنچ پایا۔ ایمانی حقائق کو جب استخراجی منطق کے ذریعے سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تو یقین کم اور شک زیادہ پیدا ہوا۔ اس ضمن میں کانٹ کی بات حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے' لہٰذا علامہ اقبال نے بھی اپنے خطبات کا آغاز اسی حوالے سے کیا ہے۔ کانٹ نے حتمی طور پر ثابت کر دیا کہ کسی منطقی دلیل سے خدا کا وجود ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ منطق میں اللہ کی ہستی کے اثبات کے لیے ایک دلیل لائیں گے تو منطق کی دوسری دلیل اسے کاٹ دے گی۔ جیسے لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اسی طرح منطق' منطق کو کاٹ دے گی۔ قرآن نے اگرچہ کہیں کہیں منطق کو استعمال تو کیا ہے لیکن وہ بھی منطقی اصطلاحات میں نہیں۔ قرآن مجید کا اسلوبِ استدلال فطری ہے اور اس کا انداز خطابی ہے۔ جیسے ایک خطیب جب خطبہ دیتا ہے تو جہاں وہ عقلی دلائل دیتا ہے وہاں جذبات سے بھی اپیل کرتا ہے۔ اس سے اس کے خطبے میں گہرائی و گیرائی پیدا ہوتی ہے۔ ایک لیکچر میں زیادہ تر دارومدار منطق پر ہوتا ہے۔ یعنی ایسی دلیل جو عقل کو قائل کر سکے۔ لیکن شعلہ بیان خطیب انسان کے جذبات کو اپیل کرتا ہے۔ اس کو خطابی دلیل کہا جاتا ہے۔ یہی خطابی انداز اور استدلال قرآن نے استعمال کیا ہے۔

انسان کی فطرت میں کچھ حقائق موجود ہیں۔ قرآن کے پیش نظر اِن حقائق کو ابھارنا مقصود ہے۔ یعنی انسان کو آمادہ کیا جائے کہ ع

''اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی!''

عقل اور منطق کا دائرہ تو بڑا محدود ہے۔ انسان اپنے اندر جھانکے تو اس کے اندر صرف عقل ہی نہیں ہے' کچھ اور بھی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

ہے نورِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

یہ جو اِس کے اندر ''کوئی اور'' شے بھی ہے' اسے اپیل کرنا ضروری ہے تاکہ انسان فطرت کی بنیاد پر اپنے اندر جھانکے اور محسوس کرے کہ ہاں یہ ہے! تاہم اس کے لیے کوئی منطقی دلیل بھی پیش کر دی جائے۔ تو یہ نورٌ علیٰ نورٍ ہوگا۔ یہ ہے درحقیقت قرآن کا فطری طرزِ استدلال۔ بعض مقامات پر ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے قرآن اپنے مخاطب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ کہہ رہا ہے اور اسے توجہ دلا رہا ہے کہ ذرا غور کرو' سوچو' اپنے اندر جھانکو۔ جیسے سورۃ ابراہیم کی آیت ۱۰ میں فرمایا گیا: ﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ﴾ ''کیا اللہ کی ہستی میں کوئی شک ہے جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے؟'' یہاں کوئی منطقی دلیل نہیں ہے' لیکن مخاطب کو دروں بینی پر آمادہ کیا جا رہا ہے کہ اپنے اندر جھانکو' تمہیں اپنے اندر ثبوت ملے گا' تمہیں اپنے اندر اللہ کی ہستی کی شہادت ملے گی۔ سورۃ الانعام کی آیت ۱۹ میں ارشاد ہوا: ﴿اَئِنَّکُمۡ لَتَشۡہَدُوۡنَ اَنَّ مَعَ اللّٰہِ اٰلِـہَۃً اُخۡرٰی ؕ﴾ ''کیا تم واقعی اس بات کی گواہی دے رہے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ بھی ہے؟'' یعنی تم یہ بات کہہ تو رہے ہو' لیکن ذرا سوچو تو سہی کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تمہاری فطرت اسے تسلیم کرتی ہے؟ اپنے باطن میں جھانکو' کیا تمہارا دل اس کی گواہی دیتا ہے؟ حالانکہ ظاہر ہے کہ وہ تو اِس کے مدعی تھے اور اپنے

معبودانِ باطل کے لیے کٹ مرنے کو تیار تھے۔ اس خطابی دلیل کے پس منظر میں یہ حقیقت موجود ہے کہ تم جانتے ہو کہ یہ محض ایک عقیدہ (dogma) ہے جو چلا آ رہا ہے' تمہارے باپ دادا کی روایت ہے' اس کی حیثیت تمہارے نسلی اعتقادات (racial creed) کی ہے۔ قرآن مجید درحقیقت انسان کی فطرت کے اندر جو شے مضمر ہے اسی کو ابھار کر باہر لانا چاہتا ہے۔ چنانچہ قرآن کا اسلوبِ استدلال منطقی نہیں ہے' بلکہ فطری ہے۔ اس کو خطابی انداز کہا جائے گا۔

۲) قرآن حکیم میں محکم اور متشابہ کی تقسیم

سورۂ آل عمران کی آیت ۷ ملاحظہ کیجیے! ارشاد ہوا: ﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ﴾ ''وہی ہے (اللہ) جس نے (اے محمدﷺ) آپ پر کتاب نازل کی' اس میں سے کچھ آیاتِ محکمات ہیں' وہی کتاب کی جڑ بنیاد ہیں اور دوسری متشابہ ہیں''۔ اس آیت میں لفظ کتاب دو دفعہ آیا ہے' دونوں کے مفہوم میں باریک سا فرق ہے۔ متشابہ ان معانی میں کہ ان کے اصل مفہوم کو سمجھنے میں اشتباہ ہو جاتا ہے' وہ آیاتِ متشابہات ہیں۔ آگے فرمایا: ﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ﴾ ''تو وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہ آیات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں (ان ہی پر غور و فکر اور ان ہی میں کھوج کرید میں لگے رہتے ہیں) اُن کی نیت ہی فتنہ اٹھانے کی ہے' اور وہ بھی ہیں جو اُس کا اصل مفہوم جاننا چاہتے ہیں''۔ ﴿وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ﴾ ''حالانکہ اس کے حقیقی معانی و مراد اللہ ہی جانتا ہے''۔ ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ ''البتہ جو لوگ علم میں پختگی کے حامل ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اس پوری کتاب پر (محکمات پر بھی اور متشابہات پر بھی)' یہ سب ہمارے ربّ کی طرف سے ہے''۔ ﴿وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ ''لیکن نصیحت نہیں حاصل کرتے مگر وہی جو ہوش مند ہیں''۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان عقلمندوں اور ہوش مندوں میں شامل کرے' رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ میں ہمارا شمار ہو!

محکم اور متشابہ سے مراد کیا ہے؟ جان لیجیے کہ ''محکم قطعی''، یعنی وہ محکم جن کے قطعی ہونے میں نہ پہلے کوئی شبہ ہو سکتا تھا نہ اَب ہے' نہ آئندہ ہو گا' وہ تو قرآن حکیم کے اوامر و نواہی ہیں۔ یعنی یہ کرو' یہ نہ کرو' یہ حلال ہے' یہ حرام ہے' یہ جائز ہے' یہ ناجائز ہے' یہ پسندیدہ ہے' یہ ناپسندیدہ ہے' یہ اللہ کو پسند ہے اور یہ اللہ کو ناپسند ہے!

قرآن حکیم کا عملی حصہ درحقیقت محکمات ہی پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں کتاب کا لفظ دو مرتبہ آیا ہے۔ پہلے بحیثیت مجموعی پورے قرآن کے لیے فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ﴾ قرآن مجید کا جو حصہ عملی ہدایات پر مشتمل ہے اس کے لیے بھی لفظ ''کتاب'' مخصوص ہے۔ چنانچہ دوسری مرتبہ جو لفظ کتاب آیا ہے ﴿هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ﴾ وہ اسی مفہوم میں ہے۔ جہاں کوئی شے واجب کی جاتی ہے وہاں ''کُتِبَ'' کا لفظ آتا ہے۔ جیسے ﴿کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ﴾...... ﴿کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ﴾ ...... ﴿کُتِبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ﴾ نماز کے بارے میں فرمایا: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ یہاں کتاب سے مراد وہ حکم ہے جو دیا گیا ہے' تو اِن معانی میں ﴿هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ﴾ سے مراد قانون' شریعت' عملی ہدایات' اوامر و نواہی ہیں اور اصل میں وہی محکمات ہیں۔

دائمی متشابہات عالمِ غیب اور اس کے ضمن میں عالمِ برزخ' عالمِ آخرت' عالمِ ارواح' ملائکہ کا عالَم اور عالمِ امثال وغیرہ ہیں۔ یہ درحقیقت وہ دائرہ ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے اور اس کی حقیقتوں کو کما حقہٗ اس زندگی میں سمجھنا محال اور ناممکن ہے۔ لیکن ان کا ایک علم دیا جانا ضروری تھا۔ مابعد الطبیعیات ایمانیات کے لیے ضروری ہے کہ اس سب کا ایک اجمالی خاکہ سامنے ہو۔ ہر انسان نے مرنا ہے' مرنے کے فوراً بعد عالمِ برزخ میں یہ کچھ ہونا ہے' بعث بعد الموت ہے' حشر نشر ہے' حساب کتاب ہے' جنت و دوزخ ہے۔ ان حقیقتوں کا اجمالی علم موجود نہ ہو تو بنیادی ضرورت کے طور پر انسان کو جو فلسفہ درکار ہے وہ اس کو فراہم نہیں ہو گا۔ لیکن اِن کی حقیقتوں تک رسائی اس زندگی میں رہتے ہوئے ہمارے لیے ممکن نہیں' لہٰذا ان کا جو علم دیا گیا ہے وہ آیاتِ

متشابہات ہیں' اور وہ دائماً متشابہات ہی رہیں گی۔ ہاں جب اُس عالم میں آنکھ کھلے گی تو اصل حقیقت معلوم ہوگی' یہاں معلوم نہیں ہوسکتی۔

البتہ متشابہات کا ایک دوسرا دائرہ ہے جو تدریجاً متشابہات سے محکمات کی طرف آ رہا ہے۔ وہ دائرہ مظاہرِ طبیعی (physical phenomena) سے متعلق ہے۔ آج سے ہزار سال پہلے اس کا دائرہ بہت وسیع تھا' آج یہ کچھ محدود ہوا ہے' لیکن اب بھی بہت سے حقائق ہم نہیں جانتے۔ سات آسمانوں کی حقیقت آج تک ہمیں معلوم نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کچھ آگے چل کر ہمارا میٹیریل سائنسز کا علم اس حد تک پہنچ جائے کہ معلوم ہو کہ یہ ہے وہ بات جو قرآن نے سات آسمانوں سے متعلق کہی تھی' لیکن اِس وقت یہ ہمارے لیے متشابہات میں سے ہے۔ اسی طرح ایک آیت ﴿كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۴۰﴾ (یٰسٓ) (ہر شے اپنے مدار میں تیر رہی ہے) اس کو پہلے انسان نہیں سمجھ سکتا تھا' لیکن آج یہ حقیقت محکم ہو کر سامنے آ گئی ہے کہ ع

''لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں!''

اگر آپ نظامِ شمسی کو دیکھیں تو ہر چیز حرکت میں ہے۔ کہکشاں کو دیکھیں تو ہر شے حرکت میں ہے۔ کہکشائیں ایک دوسرے سے دُور بھاگ رہی ہیں' فاصلہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ایک ذرے (atom) کا مشاہدہ کریں تو اس میں الیکٹرون اور پروٹون حرکت میں ہیں۔ گویا ہر شے حرکت میں ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل یہ بات متشابہات میں تھی' آج وہ محکمات کے دائرے میں آ گئی ہے۔ چنانچہ بہت سے وہ سائنسی حقائق جو ابھی تک انسان کو معلوم نہیں ہیں اور ان کے حوالے قرآن میں ہیں' وہ آج کے اعتبار سے تو متشابہات میں شمار ہوں گے لیکن انسان کا فزیکل سائنسز کا علم آگے بڑھے گا تو وہ تدریجاً متشابہات کے دائرے سے نکل کر محکمات کے دائرے میں آ جائیں گے۔

۳) تفسیر اور تاویل کا فرق

تفسیر اور تاویل دونوں لفظ قرآن مجید میں آئے ہیں۔ سورۃ آل عمران کی متذکرہ بالا آیت میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ﴾ ''اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا مگر اللہ''۔ تفسیر کا لفظ قرآن مجید میں سورۃ الفرقان میں آیا ہے: ﴿وَلَا یَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِیْرًا ۳۳﴾ ''اور نہیں لاتے وہ آپ کے سامنے کوئی نرالی بات مگر ہم پہنچا دیتے ہیں (اس کے جواب میں) آپ کو ٹھیک بات اور بہترین طریقے سے بات کھول دیتے ہیں''۔ یہ لفظ قرآن میں ایک ہی مرتبہ آیا ہے' جبکہ تاویل کا لفظ سترہ (۱۷) بار آیا ہے۔ اس کے کچھ اور مفاہیم بھی ہیں اور قرآن کے علاوہ کچھ اور چیزوں پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے۔ تفسیر اور تاویل میں فرق کیا ہے؟ تفسیر کا مادہ ''ف' س' ر'' ہے۔ یہ گویا ''سفر'' کی منقلب شکل ہے۔ سفر بمعنی Journey بھی ہے—— اور اس کا مطلب روشنی بھی ہے' کتاب بھی ہے۔ حروف ذرا آگے پیچھے ہوگئے ہیں' لفظ ایک ہی ہے۔ تفسیر کا معنی ہے کسی شے کا کھولنا' واضح کر دینا' کسی شے کو روشن کر دینا' لیکن یہ زیادہ تر مفردات اور الفاظ سے متعلق ہوتی ہے' جبکہ تاویل بحیثیت مجموعی کلام کا اصل مدلول ہوتی ہے کہ اس سے مراد کیا ہے' اس سے اصل مقصود کیا ہے' اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔ لہٰذا زیادہ تر یہی لفظ قرآن کے لیے مستعمل ہے۔ اگرچہ ہمارے ہاں اردو دان لوگ زیادہ تر لفظ تفسیر استعمال کرتے ہیں کہ فلاں آیت کی تفسیر' فلاں لفظ کی تفسیر' لیکن اس کے لیے قرآن کی اصل اصطلاح تاویل ہی ہے اور حدیث میں بھی یہی لفظ آیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کے لیے حضورﷺ کی دعا منقول ہے: ((اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاْوِیْلَ)) یعنی اے اللہ! اس نوجوان کو دین کا فہم اور تفقہ عطا فرما اور تاویل کا علم عطا فرما! چنانچہ کلام کی اصل حقیقت' اصل مراد' اصل مطلوب' اصل مدلول کو پا لینا تاکہ انسان اصل مقصود تک پہنچ جائے' اسے تاویل کہتے ہیں۔ ع

''جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!''

اُ ؤ ل کا مادہ عربی زبان میں کسی شے کی طرف لوٹنے کے مفہوم میں آتا ہے۔ اسی لیے لوگ کہتے ہیں ہم فلاں کی آل ہیں' یعنی وہ کسی بڑی شخصیت کی طرف اپنی نسبت

کرتے ہیں۔ ''آلِ فرعون'' کا مطلب فرعون کی اولاد نہیں ہے' بلکہ ''فرعون والے' فرعونی'' ہے۔ وہ فرعون ہی کی اطاعت کرتے تھے اور اسی کو اپنا معبود یعنی حاکم اور پیشوا سمجھتے تھے۔ اسی معنی میں کسی عبارت کو اُس کے اصل مفہوم کی طرف لوٹانا تاویل ہے۔ تفسیر اور تاویل کے مابین اس فرق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

۴) تاویلِ عام اور تاویلِ خاص

قرآن حکیم کی کسی ایک آیت یا چند آیات کے مجموعے یا کسی خاص مضمون جو چند آیات میں مکمل ہو رہا ہے' پر غور کرنے میں دو مرحلے ہمیشہ پیش نظر رہنے چاہئیں: ایک تاویل خاص' دوسرے تاویل عام۔ اس سلسلہ میں یاد رہے کہ قرآن حکیم زمان و مکان کے ایک خاص تناظر میں نازل ہوا ہے۔ اس کا زمانۂ نزول ۶۱۰ء سے ۶۳۲ء کے عرصے پر محیط ہے اور اس کے نزول کی جگہ سرزمین حجاز ہے۔ اس کا ایک خاص پس منظر ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر اُس وقت اور اُس علاقے کے لوگوں کے عقائد و نظریات اور ان کی ذہنی سطح کو ملحوظ نہ رکھا جاتا تو ان تک ابلاغ ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ تو اُمّی تھے' پڑھے لکھے نہ تھے۔ اگر انہیں فلسفہ پڑھانا شروع کر دیا جاتا' سائنسی علوم کے بارے میں بتایا جاتا تو یہ باتیں اُن کے سروں کے اوپر سے گزر جاتیں۔ قرآنی آیات تو ان کے دل و دماغ میں پیوست ہو گئیں' کیونکہ براہِ راست ابلاغ تھا' کوئی barrier موجود نہیں تھا۔ تو قرآن حکیم کا یہ شانِ نزول ذہن میں رکھیے۔ ویسے تو ''شانِ نزول'' کی اصطلاح کسی خاص آیت کے لیے استعمال ہوتی ہے' لیکن ایک خاص time and space complex میں قرآن حکیم کا ایک مجموعی شانِ نزول ہے جس میں یہ نازل ہوا۔ وہاں کے حالات' اس عرصے کے واقعات' ان حالات میں تدریجاً جو تبدیلی ہوئی' پھر کون لوگ اس کے مخاطب تھے' مکّے والوں کے عقائد' ان کی رسمیں ریتیں' ان کے نظریات' ان کے مسلّمات' ان کی دلچسپیاں...... جب قرآن کو اس سیاق و سباق (context) میں رکھ کر غور کریں گے تو یہ تاویل خاص ہوگی۔ اسی میں آپ مزید تفصیل میں جائیں گے کہ فلاں آیت کا واقعاتی پس منظر کیا ہے۔ یعنی قرآن مجید کی کسی آیت یا چند آیات پر غور کرتے ہوئے اوّلاً اس کو اس کے context میں رکھ کر غور کرنا کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں اس وقت لوگوں نے ان کا مفہوم کیا سمجھا' یہ تاویل خاص ہوگی۔ البتہ قرآن مجید چونکہ نوعِ انسانی کی ابدی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے' صرف خاص علاقے اور خاص زمانے کے لوگوں کے لیے تو نازل نہیں ہوا' لہٰذا اس میں ابدی ہدایت ہے' اس اعتبار سے تاویل عام کرنا ہوگی۔

تاویل عام کے اعتبار سے الفاظ پر غور کریں گے کہ الفاظ کیا استعمال ہوئے ہیں۔ یہ الفاظ جب ترکیبوں کی شکل اختیار کرتے ہیں تو کیا ترکیبیں بنتی ہیں۔ پھر آیات کا باہمی ربط کیا ہے' سیاق و سباق کیا ہے؟ یہ آیات جس سورۃ میں آئیں اس کا عمود کیا ہے' اس سورۃ کا جوڑا کون سا ہے' یہ سورۃ کس سلسلۂ سُوَر کا حصہ ہے۔ پھر وہ سورتیں مکّی اور مدنی کون سے گروپ میں شامل ہیں' ان کا مرکزی مضمون کیا ہے؟ اس پس منظر میں ایک سیاق و سباق متن (text) کا ہوگا' جس سے ہمیں تاویلِ عام معلوم ہوگی اور ایک سیاق و سباق واقعات کا ہوگا' جس سے ہمیں ان آیات کی تاویلِ خاص معلوم ہوگی۔

اگر ہم قرآن مجید کی موجودہ ترتیب کے اعتبار سے آیات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جس ترتیب سے اِس وقت قرآن مجید موجود ہے اصل حجت یہی ہے' یہی اصل ترتیب ہے' یہی لوحِ محفوظ کی ترتیب ہے۔ تاویل عام کے اعتبار سے ایک اصولی بات یاد رکھیں: **الاعتبار لعموم اللفظ لا لخصوص السبب.** یعنی اصل اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوگا نہ کہ خاص شانِ نزول کا۔ دیکھا جائے گا کہ جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کا مفہوم و معنی' نیز مدلول کیا ہے۔ کلامِ عرب سے دلائل لائے جائیں گے کہ وہ انہیں کن معانی میں استعمال کرتے تھے۔ اُس لفظ کے عموم کا اعتبار ہوگا نہ کہ اُس کے شانِ نزول کا۔ لیکن اس کا یہ معنی بھی نہیں کہ اسے بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ سب سے مناسب بات یہی ہوگی کہ پہلے اس کی تاویل خاص پر غور کریں اور پھر اس کے ابدی سرچشمۂ ہدایت ہونے کے ناطے اس کے عموم پر غور کریں۔ اس اعتبار سے تاویل خاص اور

تاویل عام کے فرق کو ذہن میں رکھیں۔

۵) تذکر و تدبر

تذکر اور تدبر دونوں الفاظ الگ الگ تو بہت جگہ آئے ہیں' سورۃ صٓ کی آیت ۲۹ میں یکجا آ گئے ہیں: ﴿كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوۡۤا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴾ ''یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے نبیؐ) ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں''۔ ان دونوں کا مطلب کیا ہے؟ ایک ہے قرآن مجید سے ہدایت اخذ کر لینا' نصیحت حاصل کر لینا' اصل راہ نمائی حاصل کر لینا' جس کو کہ مولانا روم نے کہا ؏
''ما ز قرآں مغز ہا برداشتیم''، یعنی قرآن کا جو اصل مغز ہے وہ تو ہم نے لے لیا۔ اس کا اصل مغز ''ہدایت'' ہے۔ اس مرحلے پر قرآن جو لفظ استعمال کرتا ہے وہ ''تذکر'' ہے۔ یہ لفظ ذکر سے بنا ہے۔ تذکر یاددہانی کو کہتے ہیں۔ اب اس کا تعلق اسی بات سے جڑ جائے گا جو قرآن کے اسلوبِ استدلال کے ضمن میں پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ یعنی قرآن مجید جن اصل حقائق (مابعد الطبیعیاتی حقیقتوں) کی طرف راہنمائی کرتا ہے وہ فطرتِ انسانی میں مضمر ہیں' ان پر صرف ذہول اور نسیان کے پردے پڑ گئے ہیں۔ مثلاً آپ کو کوئی بات کچھ عرصہ قبل معلوم تھی' لیکن اب اس کی طرف دھیان نہیں رہا اور وہ آپ کی یادداشت کے ذخیرے میں گہری اتر گئی ہے اور اب یاد نہیں آتی' لیکن کسی روز اُس کی طرف کوئی ہلکا سا اشارہ ملتے ہی آپ کو وہ پوری بات یاد آ جاتی ہے۔ جیسے آپ کا کوئی دوست تھا' کسی زمانے میں بے تکلفی تھی' صبح شام ملاقاتیں تھیں' اب طویل عرصہ ہو گیا' کبھی اس کی یاد نہیں آئی۔ ایسا نہیں کہ آپ کو یاد نہیں رہا' بلکہ ذہول ہے' نسیان ہے' توجہ اُدھر نہیں ہے' کبھی ذہن اُدھر منتقل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن اچانک کسی روز آپ نے اپنا ٹرنک کھولا اور اس میں سے کوئی قلم یا رومال جو اُس نے کبھی دیا ہو برآمد ہو گیا تو فوراً آپ کو اپنا وہ دوست یاد آ جائے گا۔ یہ phenomenon تذکر ہے۔ تذکر کا مطلب تعلّم نہیں ہے۔ تعلّم علم حاصل کرنا یعنی نئی بات جاننا ہے' جبکہ تذکر پہلے سے حاصل شدہ علم جس پر ذہول اور نسیان کے جو پردے پڑ گئے تھے' ان کو ہٹا کر اندر سے اسے برآمد کرنا ہے۔ فطرتِ انسانی کے اندر اللہ کی محبت' اللہ کی معرفت کے حقائق مضمر ہیں۔ یہ فطرت میں موجود ہیں' صرف اُن پر پردے پڑ گئے ہیں' دنیا کی محبت غالب آ گئی ہے۔ ؎

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے! (فیضؔ)

یہاں کی دلچسپیوں' مسائل' مشکلات' مصروفیات' مشاغل کی وجہ سے ذہول ہو گیا ہے' پردہ پڑ گیا ہے۔ تذکر یہ ہے کہ اس پردے کو ہٹا دیا جائے۔ ؏

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں' لوحِ جبیں تازہ کریں! (حفیظؔ)

یادداشت کو recall کرنا اور اپنی فطرت میں مضمر حقائق کو اجاگر کر لینا تذکر ہے۔ قرآن کا اصل ہدف یہی ہے اور اس اعتبار سے قرآن کا دعویٰ سورۃ القمر میں چار مرتبہ آیا ہے: ﴿وَلَقَدۡ يَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ﴾ ''ہم نے قرآن کو تذکر کے لیے بہت آسان بنا دیا ہے' تو کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟'' اس کے لیے بہت گہرائی میں غوطہ زنی کرنے کی ضرورت نہیں ہے' بہت مشقت و محنت مطلوب نہیں ہے۔ انسان کے اندر طلبِ حقیقت ہو اور قرآن سے براہِ راست رابطہ (Communication) ہو جائے تو تذکر حاصل ہو جائے گا۔ اس کی شرط صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ انسان کو اتنی عربی ضرور آتی ہو کہ وہ قرآن سے ہم کلام ہو جائے۔ اگر آپ ترجمہ دیکھیں گے تو کچھ معلومات تو حاصل ہوں گی' تذکر نہیں ہو گا۔ اقبال نے کہا تھا: ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف!

تذکر کے عمل کا اثر تو یہ ہے کہ آپ کے اندر کے مضمر حقائق ابھر کر آپ کے شعور کی سطح پر

دوبارہ آ جائیں۔ یہ نہ ہو کہ پہلے آپ نے متن کو پڑھا، پھر ترجمہ دیکھا، حاشیہ دیکھا، اس کے بعد اگلی آیت کی طرف گئے تو تسلسل ٹوٹ گیا اور کلام کی تاثیر ختم ہو گئی۔ ترجمہ سے کلام کی اصل تاثیر باقی نہیں رہتی۔ شیکسپئر کی کوئی عبارت آپ انگریزی میں پڑھیں گے تو جھوم جائیں گے، اگر اس کا ترجمہ کریں گے تو اس کا وہ اثر نہیں ہوگا۔ اسی طرح غالبؔ کا شعر ہو یا میرؔ کا، اس کا انگریزی میں ترجمہ کریں گے تو وہ اثر باقی نہیں رہے گا اور آپ وجد میں نہیں آئیں گے، جھوم جھوم نہیں جائیں گے۔ عربی زبان کا اتنا علم کہ آپ عربی متن کو براہ راست سمجھ سکیں، تذکر کی بنیادی شرط ہے۔ چنانچہ اوّلاً حسنِ نیت ہو، طلبِ ہدایت ہو، تعصب کی پٹی نہ بندھی ہو، اور ثانیاً عربی زبان کا اتنا علم ہو کہ آپ براہِ راست اس سے ہم کلام ہو رہے ہوں، یہ دونوں شرطیں پوری ہو جائیں تو تذکر ہو جائے گا۔

دوبارہ ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ آیت کا مطلب نشانی ہے۔ نشانی اسے کہتے ہیں جس کو دیکھ کر ذہن کسی اور شے کی طرف منتقل ہو جائے۔ آپ نے قلم یا رومال دیکھا تو ذہن دوست کی طرف منتقل ہو گیا جس سے ملے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا تھا اور اس کا کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا۔ مولانا روم کہتے ہیں ؎

خشک تار و خشک مغز و خشک پوست
از کجا می آید ایں آوازِ دوست؟

ہمارا ایک ازلی دوست ہے ''اللہ''، وہی ہمارا خالق ہے، ہمارا باری ہے، ہمارا ربّ ہے۔ اس کی دوستی پر کچھ پردے پڑ گئے ہیں، اس پر کچھ ذہول طاری ہو گیا ہے۔ قرآن اس دوست کی یاد دلانے کے لیے آیا ہے۔

اس کے برعکس تدبر گہرائی میں غوطہ زن ہونے کو کہتے ہیں۔ ع ''قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!'' تدبر کے اعتبار سے قرآن حکیم مشکل ترین کتاب ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ کہ اس کا منبع اور سرچشمہ علمِ الٰہی ہے اور علمِ الٰہی لامتناہی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کلام میں متکلم کی ساری صفات موجود ہوتی ہیں، لہٰذا یہ کلام لامتناہی ہے۔

اس کو کوئی شخص نہ عبور کر سکتا ہے نہ گہرائی میں اس کی تہہ تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے، چاہے پوری پوری زندگیاں کھپا لیں۔ وہ چاہے صاحبِ کشاف ہوں، صاحبِ تفسیر کبیر ہوں، کسے باشد۔ اس کا احاطہ کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ بعض لوگ غیر محتاط انداز میں یہ الفاظ استعمال کر دیتے ہیں کہ ''انہیں قرآن پر بڑا عبور حاصل ہے۔'' یہ قرآن کے لیے بڑا توہین آمیز کلمہ ہے۔ عبور ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ جانے کو کہتے ہیں۔ قرآن کا تو کنارہ ہی کوئی نہیں ہے۔ کسی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ قرآن پر عبور حاصل کرے۔ یہ ناممکنات میں سے ہے۔ اسی طرح اس کی گہرائی تک پہنچ جانا بھی ناممکن ہے۔

اس سلسلہ میں ایک تمثیل سے بات کسی قدر واضح ہو جائے گی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سمندر میں کوئی ٹینکر تیل لے کر جا رہا ہے اور کسی وجہ سے اچانک تیل لیک کرنے لگ جاتا ہے۔ لیکن وہ تیل سطحِ سمندر کے اوپر ہی رہتا ہے، نیچے نہیں جاتا۔ سطحِ سمندر پر اوپر تیل کی تہہ اور نیچے پانی ہوتا ہے اور وہ تیل پانچ دس میل تک پھیل جاتا ہے۔ سمندر کی اتھاہ گہرائی کے باوجود تیل سطحِ آب پر ہی رہتا ہے۔ اسی طرح سمجھئے کہ قرآن مجید کی اصل ہدایت اور اصل تذکر اس کی سطح پر موجود ہے۔ اس تک رسائی کے لیے سائنس دان یا فلسفی ہونا، عربی ادب کا ماہر ہونا، کلامِ جاہلی کا عالم ہونا ضروری نہیں۔ صرف دو چیزیں موجود ہوں۔ پہلی خلوصِ نیت اور طلبِ ہدایت، دوسری قرآن سے براہِ راست ہم کلامی کا شرف اور اس کی صلاحیت۔ یہ دونوں ہیں تو تذکر کا تقاضا پورا ہو جائے گا۔ البتہ تدبر کے لیے گہرائی میں اترنا ہوگا اور اس بحرِ زخّار میں غوطہ زنی کرنا ہوگی۔ تدبر کا حق ادا کرنے کے لیے شعرِ جاہلی کو بھی جاننا ضروری ہے۔ ہر لفظ کی پہچان ضروری ہے کہ جس دور میں قرآن نازل ہوا اُس زمانے اور اُس علاقے کے لوگوں میں اس لفظ کا مفہوم کیا تھا، یہ کن معانی میں استعمال ہو رہا تھا۔ قرآن نے بنیادی اصطلاحات وہیں سے اخذ کی ہیں۔ وہی الفاظ جن کو عرب اپنے اشعار اور خطبات کے اندر استعمال کرتے تھے انہی کو قرآن مجید نے لیا ہے۔ چنانچہ نزولِ قرآن کے دَور کی زبان کو پہچاننا اور اس

کے لیےضروری مہارت کا ہونا تدبر کے لیے ناگزیر ہے۔ پھر یہ کہ احادیث‘علمِ بیان‘ منطق‘ان سب کوانسان بطریقِ تدبر جانے گا تو پھر وہ اس کا حق ادا کر سکے گا۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اپنی تفسیر کا نام ہی ’’تدبر قرآن‘‘ رکھا ہےاور وہ تدبر قرآن کے بہت بڑے داعی ہیں۔اس کے لیے انہوں نے اپنی زندگی میں بہت محنت کی ہے۔ان کے بعض شاگرد حضرات نے بھی محنتیں کی ہیں اور وقت لگایا ہے۔اس کے ان تقاضوں کوتو اُن حضرات نے بیان کیا ہے‘لیکن تدبر قرآن کا ایک اور تقاضا بھی ہے جو بدقسمتی سے ان کے سامنے بھی نہیں آیا۔اگر وہ تقاضا بھی پورا نہیں ہوگا تو عصرِ حاضر کے تدبر کا حق ادا نہیں ہوگا۔ وہ تقاضا یہ ہے کہ علم انسانی آج جس لیول تک پہنچ گیا ہے‘میٹیریل سائنسز کے مختلف علوم کے ضمن میں جو کچھ معلومات انسان کوحاصل ہوچکی ہیں اور وہ خیالات ونظریات جن کو آج دنیا میں مانا جارہا ہے ان سے آگاہی حاصل کی جائے۔ اگر ان کا اجمالی علم نہیں ہے تو اِس دَور کے تدبر قرآن کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔قرآن حکیم وہ کتاب ہے جو ہر دَور کے اُفق پرخورشیدِ تازہ کی مانند طلوع ہوگی۔آج سے سو برس پہلے کے قرآن اور آج کے قرآن میں اس حوالے سے فرق ہوگا۔متن اور الفاظ وہی ہیں‘لیکن آج علم انسانی کی جو سطح ہے اس پر اس قرآن کے فہم اور اس کے علم کو جس طریقے سے جلوہ گر ہونا چاہیے اگر آپ اس کا حق ادا نہیں کر رہے تو آپ سو برس پہلے کا قرآن پڑھ رہے ہیں‘ آج کا قرآن نہیں پڑھ رہے۔ جیسے اللہ کی شان ہے ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ﴾ اسی طرح کا معاملہ قرآن حکیم کا بھی ہے۔

اسی طرح ہدایتِ عملی کے ضمن میں اقتصادیات‘ سماجیات اور نفسیاتِ انسانی کے سلسلہ میں راہنمائی اور حقائق قرآن میں موجود ہیں‘ انہیں کیسے سمجھیں گے؟ قرآن کی اصل تعلیمات کی قدر و قیمت اور اس کی اصل evaluation کیسے ممکن ہے اگر انسان آج کے اقتصادی مسائل کو نہ جانتا ہو؟ اس کے بغیر وہ تدبر قرآن کا حق نہیں ادا کر سکتا۔ مثلاً آج کے اقتصادی مسائل کیا ہیں؟ پیپر کرنسی کی حقیقت کیا ہے؟ اقتصادیات کے اصول و مبادی کیا ہیں؟ بینکنگ کی اصل بنیاد کیا ہے؟ کس طرح کچھ لوگوں نے اس پوری نوعِ انسانی کو معاشی اعتبار سے بےبس کیا ہوا ہے۔اس حقیقت کو جب تک نہیں سمجھیں گے تو آج کے دَور میں قرآن حکیم کی اقتصادی تعلیمات واضح کرنے کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ آج تدبر قرآن کسی ایک انسان کے بس کا روگ ہی نہیں رہا‘ اس کے لیے تو ایک جماعت درکار ہے۔ میرے کتابچے ’’مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق‘‘ کے باب ’’تذکر وتدبر‘‘ میں یہ تصور پیش کیا گیا ہے کہ ایسی یونیورسٹیز قائم ہوں جن کا اصل مرکزی شعبہ ’’تدبر قرآن‘‘ کا ہو۔ جو شخص بھی اس یونیورسٹی کا طالب علم ہو‘ وہ عربی زبان سیکھے اور قرآن پڑھے۔لیکن اس مرکزی شعبے کے گرد تمام علومِ عقلی‘ جیسے منطق‘ مابعد الطبیعیات‘ اخلاقیات‘ نفسیات اور الٰہیات‘ علومِ عمرانی جیسے معاشیات‘ سیاسیات اور قانون‘اور علومِ طبعی‘ جیسے ریاضی‘ کیمیا‘ طبیعیات‘ ارضیات اور فلکیات وغیرہ کے شعبوں کا ایک حصار قائم ہو‘اور ہر ایک طالب علم ’’تدبر قرآن‘‘ کی لازماً اور ایک یا اس سے زائد دوسرے علوم کی اپنے ذوق کے مطابق تحصیل کرے اور اس طرح ان شعبہ ہائے علوم میں قرآن کے علم و ہدایت کو تحقیقی طور پر اخذ کر کے مؤثر انداز میں پیش کر سکے۔ طالب علم وہ بھی پڑھے تب معلوم ہوگا کہ اس شعبے میں انسان آج کہاں کھڑا ہے اور قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ فلاں شعبے میں نوعِ انسانی کے کیا مسائل ہیں اور اس ضمن میں قرآن حکیم کیا کہتا ہے۔مختلف شعبے مل کر تدبر قرآن کی ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں جو وقت کا اہم تقاضا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا‘ تذکر کے اعتبار سے قرآن آسان ترین کتاب ہے جو ہماری فطرت کی پکار ہے۔ ع ’’میں نے یہ جانا کہ گویا یہ ہی میرے دل میں تھا!‘‘ اگر انسان کی فطرت مسخ شدہ نہیں ہے‘ بلکہ سلیم ہے‘ صالح ہے‘ سلامتی پر قائم ہے تو وہ قرآن کو اپنے دل کی پکار محسوس کرے گا‘ اس کے اور قرآن کے درمیان کوئی حجاب نہ ہوگا‘ وہ اسے اپنے دل کی بات سمجھے گا‘ اس کے لیے عربی زبان کا صرف اتنا علم کافی ہے کہ براہِ

راست ہم کلام ہو جائے۔ جبکہ تدبر کے تقاضے پورے کرنے کسی ایک انسان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ جو شخص بھی اس میدان میں قدم رکھنا چاہے اس کے ذہن میں ایک اجمالی خاکہ ضرور ہونا چاہیے کہ آج جدید سائنسز کے اعتبار سے انسان کہاں کھڑا ہے۔ جب انسان کو اپنے مقام کی معرفت حاصل ہو جائے تو وہ قرآن مجید سے بہتر طور پر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ سمندر میں تو بے تحاشا پانی ہے' آپ اگر پانی لینا چاہتے ہیں تو جتنا بڑا کٹورا' کوئی دیگ' دیگچی یا بالٹی آپ کے پاس ہے اسی کو آپ بھر لیں گے۔ یعنی جتنا آپ کا ظرف ہوگا اتنا ہی آپ سمندر سے پانی اخذ کر سکیں گے۔ اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہ ہوگا کہ سمندر میں پانی ہی اتنا ہے! انسانی ذہن کا ظرف علوم سے بنتا ہے۔ یہ ظرف آج سے پہلے بہت تنگ تھا۔ ایک ہزار سال پہلے کا ظرفِ ذہنی بہت محدود تھا۔ انسانی علوم کے اعتبار سے آج کا ظرف بہت وسیع ہے۔ اگر آج آپ کو قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنی ہے تو آپ کو اپنا ظرف اس کے مطابق وسیع کرنا ہوگا۔ اور اگر کچھ لوگ ابھی اُسی سابق دور میں رہ رہے ہیں تو قرآن حکیم کے مخفی حقائق اُن پر منکشف نہیں ہوں گے۔

٦) عملی ہدایات اور مظاہر طبیعی کے بارے میں متضاد طرزِ عمل

قرآن حکیم میں سائنسی علوم کے جو حوالہ جات آتے ہیں اور اس میں جو عملی ہدایات ملتی ہیں' ان کے ضمن میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ ایک اعتبار سے ہمیں آگے سے آگے بڑھنا ہے اور دوسرے اعتبار سے ہمیں پیچھے سے پیچھے جانا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم پر غور و فکر کرنے والے کا انداز (attitude) دو اعتبارات سے بالکل متضاد ہونا چاہیے۔ سائنسی حوالہ جات جو قرآن میں آئے ہیں ان کی تعبیر کرنے میں آگے سے آگے جایئے۔ آج انسان کو کیا معلومات حاصل ہو چکی ہیں' کون سے حقائق پایۂ ثبوت کو پہنچ چکے ہیں' ان کے حوالے پیش نظر رہیں گے۔ اس میں پیچھے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ امام رازی اور دیگر قدیم مفسرین کو دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے بھی کچھ فرمایا ہے تو وہ بھی ہمارے لیے لازم نہیں ہے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ سائنس اور ٹیکنالوجی سکھانے نہیں آئے تھے۔ تأبیر نخل کا واقعہ پیچھے گزر چکا ہے' اس کے ضمن میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْيَاكُمْ)) ''اپنے دنیاوی معاملات کے بارے میں تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو''۔ تجرباتی علوم کے مطابق جو تمہیں علم حاصل ہے اس پر عمل کرو۔ لیکن دین کا جو عملی پہلو ہے اس میں پیچھے سے پیچھے جایئے۔ یہاں یہ دلیل نہیں چلے گی کہ جدید دَور کے تقاضے کچھ اور ہیں' جبکہ یہ دیکھنا ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے اور آپ ؐ کے صحابہ ؓ نے کیا کیا۔ اس حوالے سے قرآن کے طالب علم کا رُخ پیچھے کی طرف ہونا چاہیے کہ اسلاف نے کیا سمجھا۔ متأخرین کو چھوڑ کر متقدمین کی طرف جایئے۔ متقدمین سے تبع تابعین' پھر تابعین سے ہوتے ہوئے ''مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِىْ'' یعنی حضور ﷺ اور صحابہ ؓ کے عمل تک پہنچیے۔ اس اعتبار سے اقبال کا یہ شعر صحیح منطبق ہوتا ہے ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باُو نرسیدی تمام بولہبی ست!

دین کا عملی پہلو وہی ہے جو اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت ہے۔ اس میں اگرچہ روایات کے اختلاف کی وجہ سے کچھ فرق ہو جائے گا مگر دلیل یہی رہے گی: ((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِىْ اُصَلِّىْ)) ''نماز اِس طرح پڑھو جیسے تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو''۔ اب نماز کی جزئیات کے بارے میں روایات میں کچھ فرق ملتا ہے۔ کسی کے نزدیک ایک روایت قابل ترجیح ہے' کسی کے نزدیک دوسری۔ اس اعتبار سے جزئیات میں تھوڑا بہت فرق ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ البتہ دلیل یہی رہے گی کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کا عمل یہ تھا۔ حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان بھی نوٹ کر لیجیے: ((عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِىْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ)) ''تم پر میری سنت اختیار کرنا لازم ہے اور میرے خلفاءِ راشدین کی سنت جو ہدایت یافتہ ہیں''۔ چنانچہ حضور ﷺ کا عمل اور خلفاء راشدین کا عمل ہمارے لیے لائق تقلید ہے۔ پھر اسی سے متصل وہ چیزیں ہیں جن پر ہماری چودہ سو برس کی تاریخ میں اُمت کا اجماع رہا ہے۔

اب دنیا اسلامی سزاؤں کو وحشیانہ قرار دے کر ہم پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہی ہے اور ہمیں بنیاد پرست (Fundamentalist) کی گالی دے کر چاہتی ہے کہ ہمارے اندر معذرت خواہانہ رویہ پیدا کر دے‘ مگر ہمارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ ان باتوں سے قطعاً متاثر ہوئے بغیر دین کے عملی پہلو کے بارے میں پیچھے سے پیچھے جاتے ہوئے ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ﴾ تک پہنچ جائیں!

بدقسمتی سے ہمارے عام علماء کا حال یہ ہے کہ انہوں نے عربی علوم تو پڑھے ہیں‘ عربی مدارس سے فارغ التحصیل ہیں‘ مگر وہ آگے بڑھنے کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ انہوں نے سائنس نہیں پڑھی‘ وہ جدید علوم سے واقف نہیں‘ وہ نہیں جانتے آئن سٹائن کس بلا کا نام ہے اور اس شخص کے ذریعے طبیعیات کے اندر کتنی بڑی تبدیلی آ گئی ہے۔ نیوٹونین ایرا کیا تھا اور آئن سٹائن کا دَور کیا ہے‘ انہیں کیا پتہ! آج کائنات کا تصور کیا ہے‘ ایٹم کی ساخت کیا ہے‘ انہیں کیا معلوم! ایٹم تو پرانی بات ہو گئی‘ اب تو انسان نیوٹرون پروٹون سے بھی کہیں آگے کی باریکیوں تک پہنچ چکا ہے۔ اب ان چیزوں کو نہیں جانیں گے تو ان حقائق کو صحیح طور پر سمجھنا ممکن نہیں ہو گا۔ مظاہر طبیعی کا معاملہ تو آگے سے آگے جا رہا ہے۔ اس کی تعبیر جدید سے جدید ہونی چاہیے۔ البتہ اس ضمن میں یہ فرق ضرور ملحوظ رہنا چاہیے کہ ایک تو سائنس کے میدان کے محض نظریات (theories) ہیں جنہیں مسلّمہ حقائق کا درجہ حاصل نہیں ہے‘ جبکہ ایک وہ چیزیں ہیں جن کی تجرباتی توثیق ہو چکی ہے اور انہیں اب مسلّمہ حقائق کا درجہ حاصل ہے۔ ان دونوں میں فرق کرنا ہو گا۔ خواہ مخواہ کوئی بھی نظریہ سامنے آ جائے یا کوئی مفروضہ (hypothesis) منظر عام پر آ جائے اس پر قرآن کو منطبق کرنے کی کوشش کرنا سعی لا حاصل بلکہ مضر شے ہے۔ لیکن اصولی طور پر ہمیں ان چیزوں کی تعبیر میں آگے سے آگے بڑھنا ہے۔ اور جہاں تک دین کے عملی حصے کا تعلق ہے جسے ہم شریعت کہتے ہیں‘ یعنی اوامر و نواہی‘ حلال و حرام‘ حدود و تعزیرات وغیرہ‘ ان تمام معاملات میں ہمیں پیچھے سے پیچھے جانا ہو گا‘ یہاں تک کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں اپنے آپ کو پہنچا دیجیے۔ اس لیے کہ دین اسی کا نام ہے۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

۷) فہم قرآن کے لیے جذبۂ انقلاب کی ضرورت

فہم قرآن کے لیے بنیادی اصول اور بنیادی ہدایات یا اشارات کے ضمن میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ بات بڑی خوبصورتی سے تفہیم القرآن کے مقدمے میں کہی ہے کہ قرآن محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ کسی ڈرائنگ روم میں یا کتب خانے میں آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ کوئی محقق یا ریسرچ سکالر ڈکشنریوں اور تفسیروں کی مدد سے اسے سمجھنا چاہے تو نہیں سمجھ سکے گا۔ اس لیے کہ یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ مولانا مرحوم لکھتے ہیں:

”......اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاعِ کفر و دین اور معرکۂ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کشمکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں! اسے تو پوری طرح آپ اُسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اُسی طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں......“

قرآن مجید کی بہت سی بڑی اہم حقیقتیں اس کے بغیر منکشف نہیں ہوں گی‘ اس لیے کہ قرآن ایک ”کتابِ انقلاب“ (Manual of Revolution) ہے۔ اس قرآن نے انسانی جدوجہد کے ذریعے عظیم انقلاب برپا کیا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھیؓ ایک حزب اللہ تھے‘ ایک جماعت اور ایک پارٹی تھے‘ انہوں نے دعوت اور انقلاب کے تمام مراحل کو طے کیا اور ہر مرحلے پر اس کی مناسبت سے ہدایات نازل ہوئیں۔ ایک مرحلہ وہ بھی تھا کہ حکم دیا جا رہا تھا کہ مار کھاؤ لیکن ہاتھ مت

اٹھاؤ۔﴿كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ﴾۔ پھر ایک مرحلہ وہ بھی آیا کہ حکم دے دیا گیا کہ اب آگے بڑھو اور جواب دو' انہیں قتل کرو۔ سورۃ الانفال میں ارشاد ہوا:﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (آیت ۳۹) ''اور ان سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے''۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا:﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ﴾ (آیت ۱۹۱) ''اور اُن کو قتل کر دو جہاں کہیں تم ان کو پاؤ اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے''۔

دونوں مراحل میں یقیناً فرق ہے' بلکہ بظاہر تضاد ہے' لیکن جاننا چاہیے کہ یہ ایک ہی جدوجہد کے دو مختلف مراحل ہیں۔ پھر ایک داعی جب دعوت دیتا ہے تو جو مسائل اسے درپیش ہوتے ہیں ان کو ایک ایسا شخص قطعاً نہیں جان سکتا جس نے اُس کوچے میں قدم ہی نہیں رکھا ہے۔ اسے کیا احساس ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ سے یہ کیوں کہا جا رہا ہے: ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَۙ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍۚ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍۚ﴾ ''قسم ہے قلم کی اور جو کچھ لکھتے ہیں! آپ اپنے ربّ کے فضل سے مجنون نہیں ہیں۔ اور آپ کے لیے تو بے انتہا اجر ہے''۔ یعنی اے نبیؐ آپ محزون اور غمگین نہ ہوں۔ آپ ان کے کہنے سے (معاذ اللہ) مجنون تو نہیں ہو جائیں گے۔ ایسے الفاظ جب کسی کو کہے جاتے ہیں تو اس کا ہی دل جانتا ہے کہ اس پر کیا گزرتی ہے۔ اندازہ لگائیے کہ قریش مکّہ سے اس قسم کے الفاظ سن کر قلبِ محمدیؐ پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہوگی۔ یہ قرآن ہم پر reveal نہیں ہو سکتا جب تک ان احساسات و کیفیات کے ساتھ ہم خود دوچار نہ ہوں۔ جب تک کہ ہماری کیفیات و احساسات اس کے ساتھ مماثلت نہ رکھیں ہم کیسے سمجھیں گے کہ کیا کہا جا رہا ہے اور کس کیفیت کے اندر کہا جا رہا ہے۔

میڈیکل کالج میں داخل ہونے والے طلبہ سب سے پہلے جس کتاب سے متعارف ہوتے ہیں وہ ''Manual of Dissection'' ہے۔ اس میں ہدایات ہوتی ہیں کہ لاش کے بدن پر یہاں شگاف لگاؤ اور کھال ہٹاؤ تو تمہیں یہ چیز نظر آئے گی' یہاں شگاف لگاؤ تو تمہیں فلاں شے نظر آئے گی' اسے یہاں سے ہٹاؤ گے تو تمہیں اس کے پیچھے فلاں چیز چھپی ہوئی نظر آئے گی۔ اس اعتبار سے قرآن حکیم ''Manual of Revolution'' ہے۔ جب تک کوئی شخص انقلابی جدوجہد میں شریک نہیں ہوگا قرآن حکیم کے معارف کا بہت بڑا خزانہ اُس کے لیے بند رہے گا۔ ایک شخص فقیہہ ہے' مفتی ہے تو وہ فقہی احکام کو ضرور اس کے اندر سے نکال لے گا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض تفاسیر ''احکام القرآن'' کے نام سے لکھی گئی ہیں جن میں صرف اُن ہی آیات کے بارے میں گفتگو اور بحث ہے جن سے کوئی نہ کوئی فقہی حکم مستنبط ہوتا ہے۔ مثلاً حلت و حرمت کا حکم' کسی شے کے فرض ہونے کا حکم جس سے عمل کا معاملہ متعلق ہے۔ باقی تو گویا قصص ہیں' تاریخی حقائق و واقعات ہیں۔ یہاں تک کہ قصۂ آدم و ابلیس جو سات مرتبہ قرآن میں آیا ہے' یا ایمانی حقائق کے لیے جو دلائل و براہین ہیں ان سے کوئی گفتگو نہیں کی گئی' بلکہ صرف احکام القرآن جو قرآن کا ایک حصہ ہے' اسی کو اہمیت دی گئی ہے۔

قرآن کے تدریجاً نزول کا سبب یہ ہے کہ صاحبِ قرآن ﷺ کی جدوجہد کے مختلف مراحل کو سمجھا جائے' ورنہ فقہی احکام تو مرتب کر کے دیے جا سکتے تھے' جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کو دے دیے گئے تھے۔ ''احکامِ عشرہ'' تختیوں پر کندہ تھے جو موسیٰؑ کے سپرد کر دیے گئے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد جس جس مرحلے سے گزرتی رہی قرآن میں اس مرحلے سے متعلق آیات نازل ہوتی رہیں۔ تنزیل کی ترتیب کے اندر مضمر اصل حکمت یہی تو ہے کہ آنحضور ﷺ کی جدوجہد' حرکت اور دعوت کے مختلف مراحل سامنے آ جاتے ہیں۔ اب بھی قرآن کی بنیاد پر اور منہجِ انقلابِ نبویؐ پر جو جدوجہد ہوگی اسے ان تمام مراحل سے ہو کر گزرنا ہوگا۔ چنانچہ کم سے کم یہ تو ہو کہ اس جدوجہد کو علمی طور پر فہم کے لیے انسان سامنے رکھے۔ اگر علمی اعتبار سے سیرت النبیؐ کا خاکہ ذہن میں موجود نہ ہو تو فہم کسی درجے میں بھی حاصل نہیں ہوگا۔ فہمِ حقیقی تو اُسی وقت حاصل ہوگا جب آپ خود اس جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں اور وہی

مسائل آپ کو پیش آ رہے ہیں تو اب معلوم ہوگا کہ یہ مقام اور مرحلہ یا مسئلہ وہ تھا جس کے لیے یہ ہدایتِ قرآنی آئی تھی۔

۸) قرآن کے منزّل من اللہ ہونے کا ثبوت

اس ضمن میں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت کیا ہے۔ یاد رکھیے کہ ثبوت دو قسم کے ہوتے ہیں' خارجی اور داخلی۔ خارجی ثبوت خود محمد رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمانا ہے کہ یہ کلام مجھ پر نازل ہوا۔ پھر آپ ﷺ کی شہادت بھی دو حیثیتوں سے ہے۔ آپ ﷺ کی شخصاً شہادت زیادہ نمایاں اُس وقت تھی جب کہ قرآن نازل ہوا اور حضور ﷺ خود موجود تھے۔ وہ لوگ بھی وہاں موجود تھے جنہوں نے آپ ﷺ کی چالیس سالہ زندگی کا مشاہدہ کیا تھا' جنہیں کاروباری شخصیت کی حیثیت سے آپ ﷺ کے معاملات کا تجربہ تھا۔ جن کے سامنے آپ ﷺ کی صداقت' دیانت' امانت اور ایفائے عہد کا پورا نقشہ موجود تھا۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر جن کے سامنے چہرۂ محمدیؐ موجود تھا۔ سلیم الفطرت انسان آپ ﷺ کا روئے انور دیکھ کر پکار اٹھتا تھا کہ سُبْحَانَ اللّٰہِ مَا ھٰذَا بِوَجْہِ کَذَّابٍ (اللہ پاک ہے' یہ چہرہ کسی جھوٹے کا ہو ہی نہیں سکتا)۔ تو حضور ﷺ کی شخصیت' آپؐ کی ذات اور آپؐ کی شہادت کہ یہ قرآن مجھ پر نازل ہوا' سب سے بڑا ثبوت تھا۔

اس اعتبار سے یاد رکھیے کہ محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن باہم ایک دوسرے کے شاہد ہیں۔ قرآن محمد ﷺ کی رسالت پر گواہی دیتا ہے: ﴿یٰسٓA وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِB اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَX﴾ قرآن گواہی دے رہا ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت ذاتِ محمدیؐ ہے۔ اس کا ایک پہلو تو وہ ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت رسول اللہ ﷺ کی ذات' آپؐ کی شخصیت' آپؐ کی سیرت و کردار' آپؐ کا اخلاق' آپؐ کا وجود' آپؐ کی شبیہ اور چہرہ سامنے تھا۔ دوسرا پہلو جو دائمی ہے اور آج بھی ہے وہ حضور ﷺ کا وہ کارنامہ ہے جو تاریخ کی اَن مٹ شہادت ہے۔ آپ ایچ جی ویلز' ایم این رائے یا ڈاکٹر مائیکل ہارٹ سے پوچھیں کہ وہ کتنا عظیم کارنامہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے سرانجام دیا۔ اور آپؐ خود کہہ رہے ہیں کہ میرا آلۂ انقلاب قرآن ہے' یہی میرا اسلحہ اور اصل طاقت ہے' یہی میری قوت کا سرچشمہ اور میری تاثیر کا منبع ہے۔ اس سے بڑی گواہی اور کیا ہوگی؟ یہ تو قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی خارجی شہادت ہے۔ یعنی ''حضورؐ کی شخصیت''۔ شہادت کا یہ پہلو حضور ﷺ کے اپنے زمانے میں اور آپ ﷺ کی حیاتِ دنیاوی کے دوران زیادہ نمایاں تھا۔ اور جہاں تک آپؐ کے کارنامے کا تعلق ہے اس پر تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ دیکھیے مائیکل ہارٹ محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہوا ہے:

"He was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels."

یعنی تاریخ انسانی میں صرف وہی واحد شخص ہیں جو سیکولر اور مذہبی دونوں میدانوں میں انتہائی کامیاب رہے ـــــ اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ تو خارجی ثبوت گویا بتمام وکمال حاصل ہوگیا۔

قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا داخلی ثبوت یہ ہے کہ انسان کا دل گواہی دے۔ داخلی ثبوت انسان کا اپنا باطنی تجربہ ہوتا ہے۔ اگر ہزار آدمی کہیں چینی میٹھی ہے مگر آپ نے نہ چکھی ہو تو آپ کہیں گے کہ جب اتنے لوگ کہہ رہے ہیں میٹھی ہے تو ہوگی میٹھی۔ ظاہر ہے ایک ہزار آدمی مجھے کیوں دھوکہ دینا چاہیں گے' یقیناً میٹھی ہوگی۔ لیکن ''ہوگی'' سے آگے بات نہیں بڑھتی۔ البتہ جب انسان چینی کو چکھ لے اور اس کی اپنی حسِّ ذائقہ بتا رہی ہو کہ یہ میٹھی ہے تو اب ''ہوگی'' نہیں ''ہے''۔ ''ہوگی'' اور ''ہے'' میں درحقیقت انسان کے ذاتی تجربے کا فرق ہے۔ افسوس یہ ہے کہ آج کی دنیا صرف خارجی تجربات کو جانتی ہے۔ ایک تجربہ اس سے کہیں زیادہ معتبر ہے اور وہ باطنی تجربہ ہے' یعنی کسی شے پر آپ کا دل گواہی دے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

تو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الٰہ اِلاّ
لغتِ غریب' جب تک تیرا دل نہ دے گواہی!

لا الٰہ الاّ اللہ کے لیے اگر دل نے گواہی نہ دی تو انسان خواہ عربی النسل ہو' عربی زبان

جانتا ہو' لیکن اس کے لیے یہ کلمہ لغتِ غریب ہی ہے' نامانوس سی بات ہے' اس کے اندر پیوست نہیں ہے' اس کو متاثر نہیں کرتی۔ قرآن انسان کی اپنی فطرت کو اپیل کرتا ہے اور انسان کو اپنے من میں جھانکنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے اپنے من میں جھانکو' دیکھو تو سہی' غور تو کرو: اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ؟ کیا تمہیں اللہ کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟ اَئِنَّکُمْ لَتَشْھَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰہِ اٰلِھَۃً اُخْرٰی؟ کیا تم واقعتاً یہ گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

علامہ ابن قیمؒ نے اس کی بڑی خوبصورت تعبیر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جب قرآن پڑھتے ہیں تو یوں محسوس کرتے ہیں کہ وہ مصحف سے نہیں پڑھ رہے بلکہ قرآن اُن کے لوحِ قلب پر لکھا ہوا ہے' وہاں سے پڑھ رہے ہیں۔ گویا فطرتِ انسانی کو قرآن مجید کے ساتھ اتنی ہم آہنگی ہو جاتی ہے۔

ہمارے دَور کے ایک صوفی بزرگ کہا کرتے ہیں کہ روحِ انسانی اور قرآن حکیم ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ جیسے ایک گاؤں کے رہنے والے ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور باہم انسیت محسوس کرتے ہیں ایسا ہی معاملہ روحِ انسانی اور قرآن حکیم کا ہے۔ قرآن کو پڑھ کر اور سن کر روحِ انسانی محسوس کرتی ہے کہ اس کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میرا ہے۔ جہاں سے میں آئی ہوں یہ کلام بھی وہیں سے آیا ہے۔ یقیناً اس کلام کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میرے وجود' میری ہستی اور میری روح کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ یہ ہم آہنگی ہے جو اصل باطنی تجربہ بن جائے تب ہی یقین ہوتا ہے کہ یہ کلام واقعتاً اللہ کا ہے۔

پیشکش pdf format از www.hamditabligh.net